Mushfiq Khwaja (Marhoom) ke Saath Ek Din
Satya Pal Anand

مشفق خواجہ (مرحوم) کے ساتھ ایک دن

ستیہ پال آنند

کراچی فروری کے شروع میں بے حد خوشگوار موسم فراہم کرتا ہے۔ میں فروری ۲۰۰۰ء میں لاہور سے جب پہنچا تو ہوائی اڈّے پر کچھ اور دوستوں کے ساتھ جو مجھے ملنے آئے تھے، میرے میزبان ڈاکٹر فہیم اعظمی (مرحوم) میرے منتظر تھے۔ جب ان کے دولت کدے پر پہنچے تو کچھ دیگر ''ٹیلیفونی'' پیغامات کے ساتھ مشفق خواجہ صاحب کے نام کی چٹ اور ان کا فون نمبر بھی تھا۔ ان کا فون ہمارے ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے سے کوئی دس منٹ پہلے آیا تھا۔ میں نے اسی وقت فون کیا۔ پوچھنے لگے، ''پہنچ گئے؟'' میں نے عرض کیا، ''جی ہاں، زندہ و سلامت، بنفس نفیس!'' بولے، ''ابھی آ جاؤ!'' میں نے فہیم اعظمی صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کا اشارہ پا کر میں نے عرض کیا، ''جی نہیں، کل یا پرسوں حاضر ہوں گا۔ مجھے یہاں ایک ہفتہ ٹھہرنا ہے''

اسی شام جوش صدی تقریبات کے سلسلے میں آخری اختتامیہ اجلاس تھا جس میں مجھے بولنا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہی جوں ہی چائے کے لیے ہال سے باہر پہنچا تو نگار صاحبہ مل گئیں۔ نگار سجاد ظہیر کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں پروفیسر تھیں (اب شاید ریٹائر ہو چکی ہیں) اور میرے اور میری بیوی کے سعودی عرب کے قیام کے دوران اپنے خاوند سجاد ظہیر صاحب کے ساتھ وہاں اس سے کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی بے حد اچھے، ملنسار اور مخلص انسان ہیں نگار صاحبہ نے خود یونیورسٹی کیمپس پر میری آمد کے سلسلے میں ''ایک شام آنند جی کے نام'' کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اسی دن دوپہر کو شعبۂ اردو میں مجھے بولنا بھی تھا۔ اس لیے طے پایا کہ اپنے گھر کی تقریب کے بعد وہ مجھے اپنی کار میں پہلے محترم

احمد ہمیش کے ہاں اور بعد میں مشفق خواجہ صاحب کے دولت کدے پر لے جائیں گی۔ یعنی یہ میری کراچی آمد کے چوتھے دن کا پروگرام تھا۔اس بیچ میں جمیل الدین عالی صاحب کے ایما پر انجمن ترقیٔ اردو کے دفتر میں ایک پر تکلف چائے اور نشست (اس میں میری خوش قسمتی سے ادا آپا بھی شریک ہوئیں) اور شام کو کلب میں ڈنر کا بھی اہتمام رہا۔

تب تک مشفق خواجہ صاحب سے ہمیشہ فون پر بات ہوتی تھی۔ انڈیا سے، سعودی عرب سے، اور امریکا سے۔ میں فون کرنے کے معاملے میں بہت تیز ہوں۔ وقفوں وقفوں کے بعد دوستوں کو پاکستان، انگلینڈ وغیرہ ان کے وقت کا خیال رکھ کر کال کرتا رہتا ہوں۔ مشفق خواجہ صاحب سے ۱۹۶۵ء سے لے کر اس ملاقات تک، کچھ نہیں تو ایک سو بار تو فون پر بات چیت ہوئی ہوگی۔ خطوط کا تبادلہ کبھی نہیں ہوا سوائے ایک دو خطوں کے۔ ایک بار ۱۹۹۶ء میں جب میری کار کا حادثہ ہوا اور میری ایک ٹانگ کے علاوہ جسم میں بھی کئی ہڈّیاں ٹوٹ گئیں تو کراچی سے ان کے پے در پے چار پانچ فون آئے ورنہ میں ہی ہر بار انھیں فون کرتا۔ امریکا سے میں اگر دیر رات فون کرتا تو وہ ناشتے کے میز پر ہوتے اور مجھے کہتے ''میں انتظار کر ہی رہا تھا۔ ذوالفقار سے کہہ رہا تھا کہ آج ڈاکٹر آنند کا فون ضرور آئے گا، انہوں نے میرا نیا کالم پڑھ لیا ہوگا اور یا تو مجھے شاباش دیں گے یا میری خبر لیں گے۔'' (برسبیل تذکرہ۔۔۔ ذوالفقار ان کے ہم زلف تھے۔ گذشتہ برس تک بقید حیات تھے اور کراچی میں ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی)۔

مجھے اس شخص سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا جس کے کوئی ایک سو سے زیادہ کالم میں نے پڑھے تھے، جس کی علمیت اور، لیاقت کا لوہا سب مانتے تھے۔ تنقید، تحقیق اور تدوین کی سطح پر جس کا ثانی اردو میں شاید ہی کوئی ہو، اور جس کے پاس وہ ہنر تھا جسے انگریزی والے کچھ اور طرح کے جملے سے شناخت دیتے ہیں۔ اس لیے، جیسے کہ میں نے کہا، مجھے مشفق خواجہ صاحب المعروف بہ ''خامہ بگوش'' سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔

نگار مجھے اندر لے کر گئیں۔ وہ ہم لوگوں کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ ملتے ہی کہنے لگے۔ ''ایک خاتون کا فون آیا تھا، انہیں یہ خیال تھا کہ آپ شاید اب تک میرے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ وہ آنے والے ہیں، آپ دوبارہ فون کیجیے گا یا اگر اپنا نمبر چھوڑنا مناسب خیال کریں تو میرے پاس چھوڑ دیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوائے ان کے کسی اور کو نہیں دوں گا اور اپنے پاس بھی ریکارڈ نہیں رکھوں گا۔'' نگار اور میں دونوں ہنسے۔ میں نے کہا، ''تو آپ ملتے ہی شروع ہو گئے؟'' بولے، ''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا''۔ گلے لگ کر ملے۔ میں نے انہیں اسم بامسمیٰ مشفق پایا۔ شفقت سے لبریز، پیار سے

چھلکتی ہوئی اس شخصیت میں خدا جانے کیا جادو تھا، مجھے ایسے لگا جیسے میری یہ ان سے پہلی ملاقات نہ ہو، جیسے ہم سینکڑوں بار پہلے مل چکے ہوں۔ خود شیلفوں پر ترتیب سے سجی ہوئی سینکڑوں کتابوں کے بیچ میں اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے، ہمارے بیٹھ جانے کے بعد نگار صاحبہ سے کہا: ''آپ نے بہت احسان کیا۔ فہیم شاید انہیں خود لے کر میرے گھر نہ آتے!'' اس سے پہلے کہ میں اس چبھتے ہوئے جملے کا مطلب سمجھ سکتا، بولے، وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ انہیں وقت ہی کب ملتا ہے۔

پہلے سرسری سی باتیں ہوئیں۔ امریکا سے کب آئے؟ لاہور کتنے دن ٹھہرے؟ اپنے گاؤں گئے تھے؟'' اور پھر خود ہی فرمانے لگے، ''آپ کی نظم 'جنم بھومی کی مٹی' پڑھ چکا ہوں۔ بہت پر اثر نظم ہے۔ پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔'' پھر راولپنڈی کے بارے میں پوچھا۔ وہیں لوگ کیا کیا لکھ رہے ہیں؟ جب میں نے بتایا کہ میں پشاور بھی ہو کر آ رہا ہوں، تو ان کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکان کا رنگ آیا۔ ''ہم تو پشاور کے صرف ایک ہی شخص سے واقف ہیں جو پاکستان تو کیا، پاکستان سے باہر انڈیا، انگلستان اور امریکا تک اردو کی بانسری بجاتا پھرتا ہے۔ مشاعروں کا کرشن کنہیا ہے۔'' پر مسکرائے، بولے، ''میری مراد اور کس سے ہو سکتی ہے؟ احمد فراز سے ہے، جو کبھی جو ہر سرحدی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

احمد فراز اور جو ہر سرحدی؟ میری استفسار میں اٹھی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر بولے، ''جی ہاں، موصوف احمد فراز بننے سے پہلے اسی نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اس سے پہلے کوئی اور نام بھی تھا، جو مجھے یاد نہیں

چھُٹ بھیّوں کا دور

میں نے پوچھا، ''آپ کے طنز میں جو کاٹ ہے، وہ قلم کاروں کے کسی مخصوص گروہ کے لیے ہے یا آپ انفرادی طور پر کسی ایک شخص کو ہی نشانۂ مشق بناتے ہیں؟

بولے، ''تیر اندازی کی مشق کون کم بخت کرتا ہے؟ مشق کرنے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ بعد میں شکاری ماہر فن ہو جاتا ہے''۔ میں نے کہا، ''آپ نے میرے الفاظ کو پکڑ لیا لیکن میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ لیجیے، دہراتا ہوں''۔... بولے، ''دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی ہاں، میں لکھنے والوں کے خاص طبقے سے ان اصحاب کا انتخاب کرتا ہوں''۔... میں نے گستاخی کی، بات کاٹ کر کہا، ''یعنی آپ صرف اصحاب کا انتخاب کرتے ہیں، خواتین کا نہیں''؟ مسکرائے، ''آپ تو اس سائے کی طرح ہیں جو شام کے وقت تیز دوڑتے ہوئے آدمی کے آگے آگے دوڑتا ہے۔... جی ہاں، خواتین کا انتخاب کم ہی کرتا ہوں، لیکن

یہ ضروری نہیں بھی ہے۔...خواتین، یعنی لکھنے والیاں، خود کو کچھ کم ہی تیس مار خاں سمجھتی ہیں۔...اب آپ تیس مار خان کی تانیث نہ لے کر بیٹھ جائیے گا!''

نگار چائے بنانے کے لیے اٹھ گئیں تو بولے، ''یہ ہے خواتین اہل قلم کی شناخت! یعنی کہ ہم مرد وئے بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک خاتون چائے بنانے کے لیے جا رہی ہے۔...'' پھر ایک لحظہ توقف کے بعد بولے، ''تو میں کہہ رہا تھا کہ میں لکھنے والوں کے ایک خاص طبقے سے ان اصحاب کو چُن لیتا ہوں جو بزعم خود تیس مار خاں ہوتے ہیں، لیکن اصل میں چھٹ بھیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں میرے دوست بھی ہیں، جاننے والے بھی ہیں، وہ بھی ہیں جنھیں میں ذاتی طور پر بالکل نہیں جانتا، لیکن اس کے باوجود ان کی نگارشات، فی البدیہات، یا سنی سنائی باتیں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں اور ان سے یہ ان کی ایک شناخت سی میرے دل میں قائم ہو جاتی ہے۔ اصل میں، آنند جی، یہ چھٹ بھیوں کا دور ہے، بلند قامتی کے دن ختم ہو گئے۔...'' مسکرائے، پھر بولے، ''دراصل نگار آپ کو آنند جی کہہ کر بلا رہی تھیں، تو میں نے بھی سوچا، میں بھی یہ جسارت کر لوں''۔

ترقی پسند تحریک

میں نے پوچھا، ''چھٹ بھیوں، یعنی بونے لوگوں کی بات آپ نے کہی۔...بلند قامتی کا دور کب تھا اور کب ختم ہوا''؟ بولے، ''میں ترقی پسند نہ تھا، نہ ہوں اور نہ کبھی ہوں گا، اُن دنوں تو وہ لوگ مجھے اگر دس کوس کی دوری سے بھی دیکھ لیتے تھے تو راستہ بدل جاتے تھے کہ نہ معلوم کیا واہی تباہی بک دوں! خیر، ترقی پسند تحریک کا دور بلند قامت اور بونے قد والے، یعنی دونوں قسموں کے لوگوں کا دور تھا۔ نثر میں منٹو (جو ترقی پسند نہیں تھا، لیکن اس دور کا ایک اہم افسانہ نگار تھا!)، کرشن چندر، بیدی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عصمت چغتائی، تنقید میں احتشام حسین، شاعری میں، فیض، جعفری اور دیگر کئی نام ہیں۔...اب کوئی مرد میدان ہے جو خم ٹھونک کر ان کے مد مقابل کھڑا ہو سکے؟ سبھی اپنی اپنی پی آر کرتے ہیں، ایوارڈوں، انعاموں اور تمغوں کے پیچھے بھاگتے ہیں''۔

''آج کے چھٹ بھیوں کے دور میں کچھ نام تو ہوں گے جنہیں بلند قامت کہا جا سکے..جیسے تنقید میں نارنگ صاحب، شمس الرحمٰن صاحب، تخلیقی نثر میں قدسیہ بانو، اشفاق احمد، انتظار حسین اور شاعری میں..''۔ میری بات کاٹ کر بولے، ''اور شاعری میں''؟ میں چپکا بیٹھا رہ گیا۔

میں نے پھر لقمہ دیا، بلکہ یکے بعد دیگرے تین لقمے دیے۔ پہلا تھا، ''ترقی پسند تحریک کے کچھ بلند قامت لوگ جن کے نام آپ نے لیے اس تحریک کے جان بحق ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہے، بلکہ

اب تک ہیں، کیا وہ بھی پبلک ریلیشننگ، ایوارڈوں، انعاموں کی لہر میں بہہ گئے''؟

جواب میں خاموش بیٹھے رہے، میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، لیکن نہیں کہتے۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کا جواب 'خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید' کے بمصداق جانتا ہوں۔

میں نے اب دوسرا لقمہ دیا۔'میں اب آپ کو quote کر رہا ہوں۔۔۔'میں نے اپنی ڈائری نکال لی۔'' آپ نے ایک بار لکھا تھا کہ ترقی پسند شاعروں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے 'زنجیر لفظوں' کے استعمال سے 'آفاقی' شاعری کی ہے۔۔۔ایک جگہ اور آپ نے لکھا ہے، کسی ترقی پسند سے غلط کام کی توقع نہیں کی جا سکتی، سوائے شاعری کے۔ اور شاعری بھی ایسا کوئی غلط کام نہیں ہے جس پر شرمانے کی ضرورت ہو۔ شرمانے کا کام پڑھنے والے بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں''۔

سوال در سوال اور جواب در جواب۔

اب ان کے پوچھنے کی باری تھی۔ فرمانے لگے،'' آپ پڑھاتے تو انگریزی ہیں، یہ اردو میں لکھنے کا چسکا آپ کو کیوں پڑ گیا؟ اور اگر پڑ ہی گیا تھا تو اپنی شاعری اور صنف غزل کے بارے میں مخالفانہ مضمون لکھنے کے حوالے سے اردو شاعری کو امریکی اور یورپی شاعری کے برابر لا کھڑا کرنے کا خیال کیسے آ گیا''؟ میں نے کہا،'' قبلہ، آپ تو میرا ہی انٹرویو لینے لگے''۔

فرمایا،''نہیں، لیکن میں آپ کو ایک مشفقانہ رائے دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہم اردو والے کبھی نئی چیز کو اپنائیں گے نہیں! اور اپنانے کا جتن بھی کریں گے تو بددلی سے، اس میں مین میخ نکال کر۔ 'اندھے کے آگے رونا اور اپنی آنکھیں کھونا' والا محاورہ ہم پر صادق آتا ہے۔ مغرب سے ہمیں خداواسطے کا بیر ہے، اور اس دشمنی میں ترقی پسند تحریک نے کچھ زیادہ ہی تلخی اور ترشی بھر دی۔ ن۔ م۔ راشد سے فیض احمد فیض کیوں بازی مار کر لے گئے؟ اس لیے نہیں کہ وہ راشد سے بہتر شاعر تھے، بلکہ اس لیے کہ فیض کے ہاں وہ رومانی تصور، تاثر اور لہجہ تھا جو غزل کی صنف کی دین ہے۔ بہر حال اب آپ اردو کو گلوبل ویلیج کی شاعری کا جزو بنانے پر تُل ہی گئے ہیں تو میں کون ہوتا ہوں آپ کو روکنے والا۔۔۔'' تب کچھ ذرا آگے جھک کر سرگوشی کے لہجے میں بولے،'' وہ جو خامہ بگوش ہے مجھ میں، ایک بار اسے خیال بھی آیا تھا کہ ایک کالم میں آپ کی گلوبل شاعری کے خواب کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے''۔

میرے لیے یہ ایک خوبصورت خبر تھی۔'' تو پھر کیا امر مانع آ گیا اس نیک خیال کو عملی جامہ پہنانے میں؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ بولے،'' میرا تحریر کردہ کالم کئی بار موصوف کو زیادہ اہمیت کا حامل بنا دیتا ہے''۔

مجھے کچھ برا نہیں محسوس ہوا۔ ماحول اس قدر دوستانہ تھا کہ ان کا یہ جملہ بھی اس میں فٹ ہو گیا۔

پھر بولے، ''چھوڑیئے اس قضیے کو! اپنی درس و تدریس اور تقابلی ادب میں ریسرچ کے کام کو جاری رکھیے اور کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ایک آدھ نظم بھی لکھ لیا کیجیے۔ اب تو، ماشاالله، جو رسالہ اٹھاؤ، اس میں سرفہرست ستیہ پال آنند کی نظم ہوتی ہے۔

میں نے کہا، ''ادا آپا نے بھی مجھے کل کچھ اس قسم کی نصیحت کی تھی کہ میں کم لکھا کروں''۔ بولے، ''عمل کیجیے اس پر! اور ہاں، مجھے بھی کچھ اور پوچھنا ہے آپ سے۔ آپ نے اردو میں لکھنا شروع کیا، پھر ہندی میں پندرہ بیس برسوں تک لکھا اور پھر اردو کی جانب لوٹ آئے۔...آخر اردو میں اتنی کیا کشش تھی''؟

میں نے عرض کیا، ''اگر صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔...اور پھر میں نے اردو میں لکھنا بالکل تو بند نہیں کیا تھا، صرف کم ہو گیا تھا۔ ہندی میں افسانوں کا معقول معاوضہ ملا کرتا تھا اور اردو میں تو لے دے کے تین رسالے ہی تھے، جو کچھ معاوضہ دیتے تھے۔ بعد میں سوائے سرکاری رسالوں کے وہ بھی کنی کترا گئے۔...پھر جب پروفیسری شروع ہوئی اور گھر میں دال روٹی کی شکل نظر آنے لگی تو میں شد و مد سے اردو میں لوٹ آیا۔ صرف ایک قلق رہ گیا ہے کہ اردو میں صرف شاعری کا شعار ہی کیوں اپنایا میں نے''۔ بولے، ''مشکل ہے، دو تین زبانوں میں لکھنا اور پھر دو تین اصناف نظم و نثر میں بھی طبع آزمائی کرنا۔ انگریزی میں بھی تو لکھا ہے آپ نے! ماشاالله کئی کتابیں چھپی ہیں اور ایک کتاب پر تو کوئی ایوارڈ بھی ملا ہے''۔

'جی ہاں''۔ میں نے کہا، ''وہ کتاب جو جواہر لال نہرو کی زندگی کے واقعات کو ان کی تحریروں سے اقتباسات اخذ کر کے لکھی گئی تھی۔ کچھ مہینوں میں ہی چالیس ہزار کے لگ بھگ فروخت ہو گئی تھی۔ میری انگریزی کتاب Great Testaments of India's Freedom Struggle کے بھی دس دس ہزار کے تین ایڈیشن چھپے اور بک گئے۔ اس میں ایک باب مہاتما گاندھی کے بارے میں بھی تھا۔...''ایک دم میں کرسی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ایک زہریلے خیال نے ڈس لیا تھا۔ میں نے پوچھا، ''آپ شاید میری رہنمائی فرما سکیں۔ میں نے ریسرچ کے طریق کار سے، گراف اور 'فلو چارٹ' بنا بنا کر، گاندھی جی کی تحریروں، 'ہریجن' میں ان کے ایڈیٹوریل، کالموں، ان کے خطوط، اور ان کی تقریروں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جو کئی لوگ کہتے ہیں، کہ گاندھی جی کو اردو کے رسم الخط پر اعتراض تھا کہ چونکہ یہ قرآن مجید کا رسم الخط بھی یہی ہے، اس لیے یہ اسلام کا سمبل ہے، اس کے بارے میں مجھے تو کہیں بھی ایک لفظ نہیں ملا۔ آپ

فرمائیں، حقیقت کیا ہے''؟

ایک لحظہ توقف کے بعد بولے،'' آپ صحیح کہتے ہیں، گاندھی جی نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ اردو کا رسم الخط اسلامی ہے اور اس لیے اس پر اعتراض ہوسکتا ہے۔ یہ ایک سیاسی شرارت تھی جس کے موجد حکیم کریوی تھے۔ اس نے کہیں، کسی غیر اہم اخبار میں یہ بات لکھ دی کہ گاندھی جی یہ بات کہتے ہیں، اور پھر کیا تھا، لوگ اسے لے اڑے، اور آج تک بغیر کسی تحریری شہادت کے اس خطرناک جھوٹ کو سچ مان کر یہ بات اس بندۂ خدا کے نام منسوب کیے جا رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ گاندھی جی نے کہیں یہ بات نہیں کہی، یوں ہی انگریزوں کی ایما پر ان کے نام مڑھ دی گئی۔ اور نہرو تو اردو پڑھتے لکھتے تھے، بے حد شستہ اردو بولتے تھے! چلیے چھوڑیے سیاسی لوگوں کی باتیں۔ چائے کا دوسرا دور تیار ہے۔

طنز آخر ہے کیا؟

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میں نے پوچھا،'' آخر طنز ہے کیا چیز، مشفق خواجہ صاحب''؟ فرمایا،'' آپ تو ادب عالیہ پڑھاتے ہیں، آپ فرمائیے''۔ میں نے عرض کیا،'' میں پڑھاتے ہوئے ہمیشہ نفی سے مثبت کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یعنی پہلے خود سے پوچھتا ہوں، فلاں چیز کیا نہیں ہے؟ اور جب ''نہیں'' کی فہرست ختم ہو جاتی ہے تو بچی کھچی چیز ہی مثبت رہ جاتی ہے اور وہی صحیح جواب ہوتا ہے''۔

بولے،'' نئی بات سنی آپ سے! پلے باندھ لی! توبہ استغفار، پروفیسروں سے کچھ پوچھنا بھی دل گردے کا کام ہے۔ اچھا تو یہ بتائیے، طنز کیا نہیں ہے؟' میں نے کہا،'' جان کی امان پاؤں تو یہ عرض کروں کہ طنز کے پیچھے، خصوصی طور پر اگر طنز ایک شخصیت کا احاطہ کرتا ہے، کیا جذبہ کارفرما ہے، اسے دیکھنا ضروری ہے۔ یعنی اگر یہ جذبہ برائی، نفرت، حقارت، لعنت و ملامت ہے، طنز نہیں۔ اگر یہ جذبہ تنقید، تخفیف، خردہ گیری ہے تو بھی طنز نہ ہو کر بد تہذیبی بن سکتا ہے۔ اس لیے طنز یہ سب کچھ تو نہیں ہے۔'' ..... کہنے لگے،'' تو باقی کیا بچا''؟ میں نے کہا،'' مثلاً اعتراض، ترچھا پن، کاٹ، طعن، چوٹ، ردّ و قدح، چشم نمائی... بشرطیکہ اس میں عیب گیری نہ ہو''۔ فرمایا،'' ٹھیک ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات کی اس فہرست میں ریشخند، ہنسی، خندہ زنی، پھبتی، کنایہ، اشارہ کو شامل کر لیجیے، تو یہ 'طنز لطیف' ہو جائے گا۔ آپ تو جوش مرحوم کی طرح الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ کیا ان سب اردو الفاظ کا انگریزی متبادل آپ کو آتا ہے؟ میں نے کہا،'' جی نہیں، جو منہ میں آیا، بولتا چلا گیا''۔ فرمانے لگے،'' اب مجھے بولنے دیجئے... طنز یقیناً بد تعریفی نہیں ہے، لیکن کھلی اڑانا تو ہے۔ ہتک و قدح نہیں ہے، لیکن پھبتی، فقرہ بازی تو ہے۔ حقارت نہیں ہے، لیکن تمسخر اور استہزا تو

ہے۔ سرزنش نہیں ہے، لیکن دھیمے لہجے میں آوازہ کستا تو ہے۔ نقل اتارنا بھی شاید اس میں شامل ہو سکے۔ سوانگ بھرنے کو آپ کیا کہیں گے؟ میلوں ٹھیلوں میں نٹ نٹیاں جب بہوساس کے سوانگ بھرتی ہیں تو کیا یہ ریشخند نہیں ہے؟ بے شک داڑھی مت نوچیں، لیکن ٹھٹھا کرنے سے آپ کو کون روک سکتا ہے؟' میں نے کہا، ''حضور، آپ تو الفاظ کے شہنشاہ ہیں''۔ فرمایا، ''یہ مجھ پر طنز ہے''۔ میں خاموش ہو گیا۔

خامہ بگوش ہی کیوں؟

ان کے سامنے جو قلم رکھا تھا وہ ''شیفر'' کا تھا۔ مجھے بار بار اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پہچان گئے کہ میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ بولے، ''ایک قدر دان دے گئے ہیں تاکہ مجھے بار بار قلم تراشنے میں اپنی انگشت شہادت ہی کہیں تراشنی نہ پڑ جائے۔... بینک کے افسر ہیں، ایسے مہنگے قلم بانٹنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

''جب لکھنا ہی پیشہ ٹھہرا...'' ذرا رک کر بولے، ''تو پیشہ وری کے ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک قلم ہاتھ میں، دوسرا کان کے پیچھے اٹکا ہوا۔...غالب تو ایک ہی قلم کان کے پیچھے اٹکائے ہوئے گلیوں گلیوں پھرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، یہاں درجنوں قلم ہیں، جنھیں قلم نہیں کرنا پڑتا۔ آپ بھی دو چار لے جائیں۔

اور واقعی انہیں نے تین چار بیش قیمت قلم میرے سامنے رکھ دیے۔ پھر بولے، ''کراچی ہی کے ایک مہربان نے ایک بار طنزاً کہا کہ مشفق خواجہ صاحب کے کان پر اٹکا ہوا قلم جب بولتا ہے تو اسی کی سنتے ہیں اور لکھتے چلے جاتے ہیں، یہاں وہاں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں نے جواباً عرض کیا تھا، ہاں، اسی لیے تو دو دو قلم رکھتا ہیں، ایک انگلیوں میں دبا ہوا اور دوسرا کان کے پیچھے دبا ہوا۔۔۔لیکن قلم دبتا کہاں ہے؟ سر چڑھ کر بولتا ہے، یہ وہ جادو ہے''۔ پھر گوہر افشانی کی، ''بھئی، ہمارے پاس شہادت کا وہ جذبہ تو نہیں ہے کہ اگر قلم چھن گیا تو خون دل میں انگلیاں ڈبو دیں اور انہی سے لکھنا شروع کر دیا۔ فیض صاحب کے پاس یہ جذبہ تھا۔ ہم تو ایک عام منشی کی طرح ہیں، جو داد و ستد یا گالی گلوچ ملتا ہے، وہی ہمارا ''منشیانہ'' ہے۔ یکدم رک کر پوچھا، ''آپ نے کہا تھا کسی چیز کے لیے...کیا یہی ہے وہ''؟ میں نے کہا، ''جی ہاں''۔

اتنی دیر میں ان کے ہم زلف ذوالفقار آ گئے۔ انہیں شاید اطلاع تھی کہ ہمیں لنچ کے لیے ایک ریستوراں جانا ہے، آتے ہی بولے، ''چلیں''؟ مشفق خواجہ صاحب نے ان کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا، ''یہ ہمارے ہم زلف ہیں۔ اب 'ز' اور 'ذ' کے فرق کو آپ نظر انداز کر دیں، تو اچھا ہے۔ بات میری

سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں چپکا بیٹھا رہا۔ یہ شاید ان کا کوئی ذاتی یا گھریلو لطیفہ تھا جس سے وہی لطف اٹھا سکتے تھے۔ کھانے کے لیے ہم ان کے ایک پسندیدہ ریستوراں میں گئے،۔ بولے، ”آپ سبزی خور ہیں کیا؟ میں نے کہا، ”جی نہیں، ہر چیز کھاتا ہوں، لیکن بسیار خور نہیں ہوں“۔ بولے، ”یقیناً بسیار خور ہی آخر میں خوار ہوتا ہے۔ بے ہنگم ڈیل ڈول، ڈھیلے ڈھالے اعضا، کندھا دینے والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے“۔

نگار اب تک خاموش بیٹھی تھیں، بولیں ”جی چاہتا ہے آنند جی ہر برس آئیں اور ہر برس آپ سے ایسی ہی ملاقات ہو۔“ بولے، ”اب تو اپنے اس بچوں والے ٹیپ ریکارڈر کو واپس تھیلے میں ڈال لیجیے، کھانے کی میز پر گفتگو ریکارڈ نہیں کی جانی چاہیے۔“ پھر بولے، ”ان شا اللہ ہر برس آئیں گے اور ہر برس ایسی ہی بات چیت ہوگی۔ اب تو مصیبت بنام ستیہ پال آنند نے گھر دیکھ لیا ہے“۔

اللہ کی رضا میرے ہر برس کراچی جانے کی اس دعا میں شامل نہیں تھی۔ میں ۲۰۰۰ء کے بعد خانگی معاملات اور خرابیٔ صحت کی بنا پر کراچی صرف دو برس پہلے ہی جا سکا اور اس مختصر مضمون میں مجھے مشفق خواجہ کو ’مرحوم‘ لکھنا پڑ رہا ہے۔